اسلامی تحریکات اور اکیسویں صدی کے چیلنج

فکرِ مودودیؒ کی روشنی میں

پروفیسر خورشید احمد

بیسویں صدی میں اسلامی فکر کی تشکیلِ نو اور اسلامی احیا کی جدید تحریکیں ایک زندہ حقیقت ہیں۔ ان تحریکوں کے ظہور اور نشوو ارتقا کی تاریخ میں چند شخصیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں' اور ہر معروضی اور منصفانہ جائزے میں ان کی حیثیت مرکزی اور کلیدی ہے' ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں مشرق اور مغرب' برعظیم پاک و ہند' عالمِ عربی' جنوب مشرقی ایشیا' یورپ اور امریکا سے اسلام اور عالمِ اسلام کے بارے میں جو بھی اہم کتاب یا تحقیقی مقالہ شائع ہوا ہے' اس میں سید مودودیؒ کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تحقیق و تالیف کا مقصد کیا ہے؟ سید مودودیؒ کی عظمت و خدمات اور ان کے کارناموں کا اعتراف یا انھیں تنقید و ملامت کا ہدف بنانا۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعے کے جلو میں کتابوں کا جو ریلا آرہا ہے یا پھر 'اسلامی بنیاد پرستی'، 'مسلم انتہا پسندی'، 'سیاسی اسلام'، 'عسکری اسلام' حتیٰ کہ 'اسلامی دہشت گردی' کے حوالوں سے جو فکری یورش جاری ہے' اس میں بھی ہر صاحبِ قلم اپنے اپنے مقاصد اور تجزیوں اور جائزوں کے مطابق سید مودودی کو نشانہ بنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہا۔ یہاں مقصد ان فکری حملوں اور قلم کاریوں کا احتساب کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اس طرف توجہ دلانا ہے کہ آج اسلام کی تہذیبی قوت اور مسلمانوں کی احیائی تحریکوں پر یلغار کرنے والے حلقے عالمِ اسلام کی جن شخصیات کو بحث کا مرکز و مدار بنا رہے ہیں' ان میں سید مودودیؒ سرفہرست ہیں۔ ایک طرف مغربی یا مغرب زدہ مخالفین ان کے افکار کو فتنے کی جڑ قرار دے رہے ہیں تو دوسری طرف اسلام کے بہی خواہ جس تبدیلی پر فخر کر رہے ہیں اور جس سرمایے کی حفاظت کے لیے کوشاں ہیں' وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس قیمتی امانت کو اُمت کے لیے حرزِ جاں بنانے میں سید مودودیؒ کی خدمات کتنی بھرپور اور فیصلہ کن ہیں۔

ترجمان القرآن کی اس اشاعتِ خاص کی مناسبت سے ہم نے مناسب سمجھا کہ کچھ وقت اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں صرف کریں کہ بیسویں صدی میں احیاے اسلام کی جدوجہد میں دوسرے احیائی مفکرین اور مصلحین کے ساتھ' سید مودودیؒ کا اصل کارنامہ کیا ہے۔ وہ کارنامہ کہ جس نے اِس صدی کے آغاز اور اس کے اختتام کے حالات میں اتنا بنیادی اور انقلابی فرق پیدا کر دیا کہ دشمن جس اُمت کو بیمار اور بے کار سمجھ کر اس کی 'تجہیز و تکفین' کی تیاریاں کر رہے تھے' وہ ایک بار پھر ایک 'عالمی خطرہ' تصور کی جارہی ہے۔ جن سامراجی قوتوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب دنیا ان کی چراگاہ ہے۔ انھیں اب 'تہذیبوں کے تصادم' کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہ نئی استعماری یلغار اور صلیبی جنگوں (Crusades) کا آغاز کرتے ہوئے' بارود' جھوٹ اور تباہی کی پوری قوت کے ساتھ عملاً میدان میں کود پڑے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ علم اور عمل دونوں میدانوں میں انھوں نے تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں۔ ایک شخص کی ذات میں فکر و تحقیق، تدبیر و اصلاح اور تنظیم و قیادت کی صلاحیتوں کا جمع ہونا اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات میں سے ہے۔ معروف شاعر ابونواس کہتا ہے:

وَمَا عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ
أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمَ فِي وَاحِدٍ

اللہ کی ذات سے بعید نہیں کہ وہ ایک عالم [کی ساری خوبیاں] کسی فردِ واحد میں جمع کر دے۔

ہمارے دور میں سید مودودیؒ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص کرم تھا جس کے نتیجے میں اُمت کوئی زندگی ملی۔

فکری میدان میں ان کے کام پر بہت پیش رفت ہوئی ہے اور اس سے زیادہ مستقبل میں ہوگی۔ بحیثیت مفسر قرآن (تفہیم القرآن ' قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ' رسائل و مسائل)' حدیث کے خادم (سنّت کی آئینی حیثیت' تفہیم الحدیث' تفہیمات) سیرت نگار (سرورِ عالمؐ، سیرت تقریریں) فقیہ (تفہیم القرآن' رسائل و مسائل) متکلم اور عصر حاضر کے اجتماعی علوم کے ناقد اور ان میدانوں میں اسلامی فکر کے شارح اور ترجمان کی حیثیت سے انھوں نے سیکڑوں چراغ روشن کیے ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنے عہد کی فکر کو صرف متاثر ہی نہیں کیا' بلکہ ایک نیا رخ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے' جس کے نتیجے میں آج دنیا کے گوشے گوشے سے ان کے افکار کی صداے بازگشت سنی جاسکتی ہیں۔

اس وقت مقصد ان پہلوؤں پر گفتگو نہیں' بلکہ سید مودودیؒ کے پورے لٹریچر کو سامنے رکھ کر ہم ان کے مرکزی کارنامے (contribution) پر توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ اس مناسبت سے صرف چند کلیدی امور پر اور وہ بھی ان کے مجموعی وژن اور اس نئے مثالیے (paradigm) کا تعین و تشریح موضوع ہوگا' جس کی تشکیل اور ترویج میں سید صاحب کا مرکزی کردار رہا ہے۔ بلاشبہہ بیسویں صدی میں علامہ اقبالؒ' مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ سے لے کر حسن البناؒ، سید قطبؒ اور مالک بن نبیؒ تک مفکرین نے اپنے اپنے انداز میں اس وژن' اس فکر اور اس مثالیے کی تشکیل و تکمیل میں اپنا اپنا حصہ بٹایا' لیکن سچی بات یہی ہے کہ ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اس مطالعے میں ہم پہلے مختصراً یہ تعین کریں گے کہ سید مودودیؒ نے فکری میدان میں اصل کارنامہ کیا انجام دیا' تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کے اصلاحی کام کے بنیادی خدوخال کس فکری اساس کے برگ و بار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ دیکھیں گے کہ اکیسویں صدی اور خصوصیت سے ۱۱ستمبر کے بعد کی دنیا اور اس میں اُمت مسلمہ کو درپیش چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سید مودودی کے روشن کردہ چراغ کیا روشنی فراہم کرتے ہیں اور اسلامی تحریکات اور ان کے قائدین کو بالخصوص جو مسائل درپیش ہیں۔ سید مودودیؒ کے فکر اور اصلاحی حکمت عملی کی روشنی میں انھیں کس طرح اور کس رخ پر آگے بڑھتے ہوئے حل کیا جاسکتا ہے۔ سید مودودی کے خیالات حرفِ آخر نہیں ہیں اور ہماری یہ کوشش بھی ایک جسارت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ اس کے باوصف ہم یہ متعین کرنے کی ایک طالب علمانہ کاوش کر رہے ہیں کہ بیسویں صدی میں تو سید مودودی نے جو کچھ خدمت انجام دی ہے اس کی عظمت اپنی جگہ' لیکن ان کی فکر اور تجربے سے بھرپور رہنمائی (inspiration) لیتے ہوئے ہمیں اکیسویں صدی میں کیا کرنے کی ضرورت ہے؟

ہم ابتدا ہی میں یہ بات کہہ دینا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی ایک انسان تھے اور کسی انسان کی فکر یا عمل ہمیشہ کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے۔ یہ مقام تو صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن کی رہنمائی اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ٥ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى - (النجم ۵۳:۳-۴)، ''وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا' یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے''۔ اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خود مولانا مودودی نے جو تربیت ہمیں دی' اس میں سب سے نمایاں پہلو یہی تھا کہ انھوں نے نہ خود کو تنقید و احتساب سے بالا رکھا اور نہ ہمیں شخصیت پرستی کی راہ پر ڈالا۔

شروع ہی میں یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے' کہ 'فکر مودودی' خود کوئی مستقل بالذات چیز نہیں ہے' بلکہ مولانا مودودیؒ کی اصل کوشش یہ تھی کہ قرآن و سنت کی تعلیم کو اس کی اصل روح کے مطابق عصری حالات و ظروف کے پس منظر میں پیش کریں اور اُمت کا رشتہ قرآن و سنت سے جوڑیں۔

مولانا مودودیؒ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن و سنت کو تحریک اور اُمت کے لیے ہدایت اور روشنی کے منبع کے طور پر پیش کیا اور اس کسوٹی پر حال اور ماضی کی ہر کوشش کو پرکھنے کا درس دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کوئی مذہبی فرقہ یا مسلک نہیں ہے' بلکہ اس نے سب فرقوں اور مسلکوں کو قرآن و سنت کی بنیاد پر ایک متحرک قوت میں ڈھال دینے کی کوشش ہے۔ بلاشبہہ' اللہ تعالیٰ ہر دور میں انسانوں ہی کو اپنے پیغام کی تجدید اور تحفیظ کے لیے ذریعہ بناتا ہے۔ چنانچہ اس حد تک ان ایسے برگزیدہ انسانوں کا ذکر اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی فطری امر ہے جو اس کارِعظیم میں انسانوں کو اٹھانے' منظم و متحرک کرنے اور پھر ایک متعین راہِ عمل پر گامزن ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے ہماری توجہ کا مرکز بھی ان رجال کار کی ذات سے زیادہ دین اسلام کی تفہیم' اس کے مقام اور سربلندی کے لیے ان کی کوششیں ہوں گی۔

علمی و فکری خدمات کا مختصر جائزہ

مولانا مودودیؒ کے اس علمی اور فکری کام کے لیے چار پہلو اہم ہیں: پہلا دین کا وہ تصور جسے انھوں نے اجاگر کیا۔ دوسرا وہ طرزِفکر' جس کے ذریعے اس کام کو انجام دیا گیا۔ تیسرے تبدیلی احوال اور احیاے دین کے لیے وہ 'حکمت عملی' جو اپنے زمانے کے حالات کی روشنی میں انھوں نے مرتب کی۔ چوتھے وہ عملی جدوجہد' اس کے اصول و ضوابط اور تنظیمی ڈھانچے اور راستے جن پر عملاً انھوں نے اپنی جدوجہد کو مرکوز کیا۔

ہم اس مضمون میں زیادہ توجہ مولانا مودودی کے 'طرزِفکر' پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں اور باقی تینوں کے بارے میں صرف مختصر اشارات پر اکتفا کریں گے اور یہ اس لیے کہ اکیسویں صدی کے لیے مولانا مودودی کے پیغام کا استنباط کرنے کے لیے توجہ کا مرکز 'فکر' سے بھی زیادہ 'طرزِفکر' ہی کو ہونا چاہیے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تصنیفی زندگی کے ساٹھ برسوں میں چھوٹی بڑی تقریباً ڈیڑھ سو کتب کی تصنیف و تالیف کی خدمت انجام دی' اور کئی سو تقاریر کے ذریعے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچایا۔ ان ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے مواد کو چند سطروں میں سمیٹنا اور محاکمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تاہم' اگر ہم سید صاحب کے طرزِفکر کے بنیادی گوشوں اور پہلوؤں کی نشان دہی کریں تو شاید انھیں مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱- حق، حق ہے اور اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ حق ہے، اللہ کا رسول حق ہے، اللہ کی کتاب حق ہے، اللہ کا دین حق ہے، اور اللہ کا وعدہ یعنی آخرت، جنت اور جہنم حق ہیں۔ ان سب کو ہمیں صرف حق ہونے کی حیثیت ہی سے قبول کرنا چاہیے۔ یہ ان کے حق ہونے کا تقاضا ہے۔ اس لیے کہ حق خود سب سے بڑی طاقت ہے--- ایمان حق کو حق تسلیم کرنے ہی سے عبارت ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے یکسوئی کے ساتھ قبول کیا جائے اور زندگی کی تمام وسعتوں میں یک رنگی اور وفاداری کا ثبوت پیش کیا جائے، اور حق کے غلبے کی جدوجہد میں تن، من، دھن سے جُت جائیں قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ج (الانعام ۶: ۱۶۲-۱۶۳)، ''کہو میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں''۔ گویا حق کے غلبے کی جدوجہد بھی حق ہی کا ایک حصہ ہے جسے صاحبِ حق کے بتائے ہوئے طریقے ہی سے جاری و ساری رکھا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ اسوہ انبیا علیہم السلام اور منہج رسالتؐ ہے اور اس کا آخری اور مکمل ترین ماڈل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ کامل ہے۔

۲- تاریخ انسانی میں انسان کے سامنے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں--- ایک اللہ کی ہدایت اور اللہ کے رسولوں اور انعام یافتہ پیروکاروں کا راستہ، اور دوسرا انسانوں کا اپنا اختراع کردہ راستہ، خواہ اس کا نام، شکل اور زمانہ کچھ بھی ہو۔ بنی نوع انسان کا اصل مسئلہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ اللہ کا ہدایت کردہ راستہ اختیار کریں یا انسان کا اپنا خود ساختہ راستہ--- آج بھی انسان کا بنیادی مسئلہ یہی ہے اور ہمیشہ رہے گا: ''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا، اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔ (البقرہ ۲: ۳۸-۳۹)

۳- انبیا علیہم السلام کے بتائے ہوئے طریقے کا نام دینِ اسلام ہے۔ کائنات کا پورا نظام اللہ کے قانون کے مطابق چل رہا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون کی پابند ہے۔ البتہ انسانوں کو آزادی کی نعمت سے نوازا گیا ہے اور ان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ بہ رضا و رغبت اللہ کے قانون (دین) کو قبول کر کے اپنی فطرت اور کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہو جائیں--- یہ سپردگی ہی اسلام ہے اور اسی کے ذریعے دل کا چین اور زندگی اور کائنات میں امن و سکون میسر آ سکتا ہے۔

۴- زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، اور دینِ اسلام نام ہے زندگی کے پورے نظام کو اللہ کی بندگی میں لانے کا۔ مراسمِ عبادت سے لے کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو اللہ کے رنگ میں رنگا ہونا چاہیے: (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ط (البقرہ ۲: ۲۰۸)، ''اے ایمان لانے والو، تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو''۔ اور صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز (البقرہ ۲: ۱۳۸)، ''کہو: اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا''۔ یہ ہدایت زندگی کے ہر شعبے اور سرگرمی کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ دین کامل اور مکمل ہے۔ اس ابدی ہدایت کا ایک معجزاتی پہلو یہ ہے کہ جہاں اس میں ہر زمانے کے لیے زندگی کی جملہ ضروریات کے لیے رہنمائی موجود ہے، وہیں اس کے نظامِ کار میں وہ گنجایش بھی موجود ہے جو مرورِ زمانہ کی تبدیلیوں اور ضروریات کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ گویا ثبات اور تغیر کا ایک حسین امتزاج ہے جو اس کے نظام کا حصہ ہے۔ جو تبدیلی اور تسلسل کے لیے ایک خودکار انتظام کا بندوبست کر دیتا ہے۔

۵- یہ دین اعتدال' انصاف' توازن اور راہِ وسط کی شان دہی کرتا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۲:۱۴۳)، ''اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'اُمت وسط' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو''۔ دین اسلام فطرت سے ہم آہنگ ہے' عدل اور فلاح کا ضامن ہے' حشو و زوائد سے پاک ہے' آزادی اور ترقی کا علم بردار ہے۔ یہ دین جسم و جاں' روح و بدن' مادی اور روحانی' اخلاقی اور دنیوی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ یہ وسطیہ اس کی شان ہے (خیر الامور اوسطھا) جو اس کا حصہ (built-in) اور شاخت ہے اور کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی۔ خود ساختہ اعتدال کے نام پر کسی تراش خراش کی اسے حاجت نہیں۔ اعتماد' رواداری' استقامت اور حکمت اس کے اپنے اصول اور شناخت کے ذرائع ہیں۔

یہ حق' یہ ہدایت' یہ دین بھی آپ سے آپ نافذ نہیں ہوتا' بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان' عمل اور جدوجہد کا راستہ تعلیم فرمایا ہے اور انبیاے کرامؑ نے اپنے عمل اور اپنی تحریک سے اس کے لیے نقشہ راہ (road map) فراہم کر دیا ہے' جو یہ ہے:

۱- اسے پورے یقین کے ساتھ قبول کرو (ایمان)

۲- اس پر خود عمل کرو اور استقامت کے ساتھ کرو۔ (اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا - الاحقاف ۴۶:۱۳)

۳- تمام انسانوں کو اس کی دعوت دو۔ (وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا - حم السجدہ ۴۱:۳۳)

۴- اس دین کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کرو--- اسے پوری زندگی پر غالب اور حکمران کرلو۔ (هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ - الصف ۶۱:۹)

ایمان اس کا نقطۂ آغاز ہے' عمل اس ایمان کا اولین تقاضا ہے' عبادت اور اللہ کی اطاعت اور بندگی اس کا فطری مظہر اور اللہ کی رضا اس کا مطلوب و مقصود ہے۔ یہ عبادت محض مراسم عبادت تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی کو اللہ کے قانون اور ہدایت کے مطابق ڈھالنے اور سنوارنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ پھر ایمان ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اس شمع کو روشن کیا جائے اور اس نور کو پھیلانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کی جائے ایک مسلسل' جاں گسل' نہ ختم ہونے والی جدوجہد۔

اسی جدوجہد کا نام جہاد ہے' جو نفس کے خلاف جہاد سے شروع ہو کر اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کے قیام اور اس کے دیے ہوئے قانونِ حیات کے نفاذ کے ہر کوشش اور ہر قربانی سے عبارت ہے اور یہی عبادت کی معراج ہے۔ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمھیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو''۔ (الصف ۶۱:۱۰-۱۱)

دعوت اور جہاد ایک ہی جدوجہد کے مختلف رخ ہیں۔ اس میں جبر اور دہشت گردی کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ، دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ البقرہ ۲:۲۵۶) یہ پیغام دلیل' مباحثے اور مجادلے' دعوت اور ڈائیلاگ' محبت' دردمندی اور خدمت سے انسانوں تک پہنچایا جاتا ہے لیکن اگر اسے قوت سے دبانے اور روکنے کی کوشش کی جائے تو پھر ظلم اور طغیان کا مردانہ وار مقابلہ اور جان اور مال کی قربانی بھی اسی جدوجہد کے اعلیٰ مراحل میں شامل ہے۔ اسی دعوت اور جدوجہد کے نتیجے میں مسلمان فرد (مرد و عورت) مسلم خاندان' مسلم معاشرہ' اسلامی ریاست و حکومت اور انصاف پر مبنی عالمی نظام وجود میں آتے ہیں۔

۶- یہ ساری جدوجہد انفرادی ذمہ داری بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ہر مسلمان 'اُمت مسلمہ کا حصہ ہے۔ یہ اُمت ایک صاحب مشن اور صاحب شریعت اُمت ہے۔ جس کا مقصد وجود اور فرضِ منصبی ہی دین حق کی شہادت 'اللہ کی بندگی کی دعوت 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر 'قیام انصاف 'مظلوموں کی مدد و اعانت اور پوری انسانیت کو اس کے رب کی بندگی کی طرف بلانا اور بندگی رب کے نظام کو قائم کرنا ہے۔ (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط - اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمرٰن ۳:۱۱۰)

۷- اس مشن (قولی اور عملی شہادت 'انفرادی اور اجتماعی شہادت 'اقامت دین) کے لیے جو راستہ اللہ کے رسولؐ نے طے کر دیا ہے وہ ہے:

اپنی اصلاح --- اجتماعیت کی اصلاح --- اخلاق و کردار اور علم و تقویٰ کی قوت کے ساتھ وسائل و ذرائع کا موثر ترین استعمال 'قوت کے منبع کی تسخیر 'بہترین صلاحیت اور استطاعت کا حصول اور طاقت کی ہر شکل کو اللہ کا مطیع اور اس کے پیغام کو پھیلانے کی خدمت کا آلہ کار بنانا 'تا کہ عدل و انصاف قائم ہو سکے 'حق حق دار کو مل سکے اور ظلم و استحصال کا خاتمہ ہو سکے۔ چنگیزیت سے انسانیت کو محفوظ رکھنے کا یہی طریقہ ہے اور یہ بھی عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ - الانفال ۸:۶۰' لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج - الحدید ۵۷:۲۵)

اس کے لیے بیک وقت تین چیزوں کی ضرورت ہے:

اولاً: ایمان 'اخلاقی برتری 'اعلیٰ کردار اور تقویٰ اور خدا ترسی کی زندگی۔

ثانیاً: فکری قوت اور قیادت۔

ثالثاً: اجتماعی قوت --- اخلاقی 'معاشی 'مادی 'سیاسی 'سائنسی 'عسکری --- مقابلے کی قوت 'تا کہ وقت کے تقاضوں اور عصری حالات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

یہ کام اللہ سے تعلق 'فکری گہرائی اور اجتماعی طاقت تینوں کے بیک وقت حصول اور مقابلے کی طاقت کی فراہمی ہی سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ایمان 'اجتہاد اور جہاد ہی وہ ستون ہیں جن پر دین کی عمارت کی تعمیر ممکن ہے اور انھی پر اس کے استحکام کا انحصار ہے۔

سیاسی مغلوبیت 'ذہنی انتشار 'اخلاقی خلفشار 'اور تہذیبی پراگندگی کے ماحول میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ آواز ایک نئے وژن کا پیغام دیتی تھی۔ سید مودودیؒ کی یہ پکار قرآن کی طرف رجوع کرنے (back to the Quran) اور قرآن کی صداقت پر کامل ایمان کے ذریعے پیش قدمی کرنے (forward with the Quran) کی دعوت تھی۔ سید مودودی کی یہی وہ فکر تھی جس نے اُمت کی مضطرب روحوں کو روشنی کا پیغام دیا 'دلیل اور تعین کے ساتھ دین کا اصل وژن پیش کیا۔ یہی وہ دعوت تھی جس نے اُمت کو نئے اعتماد 'ولولے اور اُمید سے شاد کام کیا۔ ایک طرف اسلام کی شاہراہ عمل کو صاف لفظوں میں پیش کیا تو دوسری طرف انھیں انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کا راستہ دکھایا۔ اسلام کو مسلم معاشرے کی ایک کارفرما قوت بنانے کی دعوت دی اور اسلام کو ایک عالمی پیغام اور زندگی کے دھارے کو بدلنے والی تحریک کے طور پر صرف روشناس ہی نہیں کرایا 'بلکہ فکری اور عملی و تنظیمی جدوجہد کے ذریعے ایک ملک گیر اور بالآخر عالمی جدوجہد میں منظم کر دیا۔

سید مودودیؒ کے کارنامے پر نگاہ ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ انھوں نے پہلے دن سے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ان کے دور کے مسلمانوں کی سب سے پہلی ضرورت تصورِ دین کی اصلاح ہے۔ مختلف داخلی اور خارجی اسباب کے نتیجے میں خود مسلمانوں نے بھی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کردیا تھا۔ انھوں نے دین کو گھر، مسجد اور زیادہ سے زیادہ مدرسے اور چند مذہبی رسوم و رواج تک محدود کرلیا تھا اور اسی پر قانع ہوگئے تھے۔ دین کے اس تصور پر ضرب کاری لگانا وقت کی اہم ضرورت تھی، تاکہ قرآن کا تصورِ دین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برپا کردہ انقلاب کا تصور ایک بار پھر کسی کمی بیشی کے بغیر ان کے سامنے رکھا جاسکے اور انھیں توحید اور عبادت کا صحیح مفہوم سمجھایا جاسکے۔

پھر قول و فعل کا تضاد مسلمانوں کو کھائے جا رہا تھا، جس نے اسلام کی برکتوں سے ان کی زندگیوں کو محروم کردیا تھا۔ سید مودودیؒ نے ایمان اور عمل، عبادت اور زندگی کے تمام شعبوں سے اس کے ربط کو واضح کیا۔ اسی طرح اجتماعی زندگی اور نظام کا بگاڑ، قیادت کا غلط ہاتھوں میں چلا جانا اور مسلمانوں کا قوت اور اقتدار سے محروم ہوکر، ایک محکوم قوم بن جانا تھا۔ یہ وہ اسباب تھے جن کے نتیجے میں مسلمان اپنے اصل مشن اور کردار سے غافل ہوگئے تھے اور چھوٹے چھوٹے مفادات کے پجاری بن گئے تھے۔ سید مودودی نے زوال اور کمزوری کے ان تمام اسباب کو ٹھیک ٹھیک متعین کرکے ان کا موثر سدباب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اور اُمت کی ساری توجہ کو جزوی اور وقتی مسائل اور معاملات سے ہٹا کر چند مرکزی نکات پر مرکوز کیا، جنھیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

- خودشناسی، یعنی مغرب کی اندھی تقلید اور غیروں کے غلبے کے نتیجے میں خودفراموشی کے رویے کو ترک کرکے اپنی حقیقت، اپنی اصل، اپنی شناخت کی بازیافت کرنا۔
- خودشناسی کے نتیجے میں ایک خوداعتمادی پیدا کی جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے ورثے پر فخر کرنے لگے اور ان میں اپنی راہ خود نکالنے یعنی خودانحصاری کا داعیہ پیدا ہوا۔
- خوداعتمادی اور خودانحصاری کے ساتھ خوداحتسابی، تاکہ اپنی کمزوریوں کا تعین کیا جاسکے، اور ان کمزوریوں کو دُور کرکے اپنے مشن اور مقام کے حصول کے لیے تیاری کی جاسکے۔
- خودشناسی، خوداعتمادی، خودانحصاری اور خوداحتسابی کے ساتھ ضروری تھا کہ اپنے دور کے تقاضوں اور اپنے زمانے کے مسائل و معاملات اور مدمقابل کی قوتوں کے عزائم، وسائل اور ان کی قوت کے سرچشموں کا ادراک ہو، تاکہ دانش مندی سے ان کا موثر مقابلہ ہوسکے۔ اس کے لیے زمانہ شناسی ضروری ہے کہ مستقبل کی کوئی بھی تعمیر ان حالات اور ظروف سے بے نیاز ہوکر نہیں کی جاسکتی جن سے اُمت دوچار ہے۔ حقیقت پسندی کا راستہ حالات کی صحیح آگہی ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔
- ان چار امور کا لازمی تقاضا خودسازی ہے، کہ تیاری کے بغیر مقابلہ حماقت اور خودفریبی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے سید مودودی نے قوم کو جذباتیت اور فوری ردعمل کے بجائے اپنی قوت کے سرچشموں کی بنیاد پر مناسب اور موثر تیاری کی دعوت دی، تاکہ صحیح وقت پر صحیح طریقے سے مقابلہ کیا جاسکے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ تیاری ہمہ پہلو ہونی چاہیے۔ ایمان و اعتقاد، فکر و عمل، انفرادی اور اجتماعی زندگی، اخلاقی اور مادی قوت، سیاسی، معاشی، عسکری، فنی، تکنیکی میدانوں میں مقابلے کی قوت اور تنظیم کا حصول بنیادی تقاضے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اصلاح اور تعمیر نو کا ایک واضح اور دور رس پروگرام مرتب کیا۔ وہ اس پروگرام پر عمل کے لیے خود بھی سرگرم عمل ہوئے اور اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کو بھی مصروف کار کیا۔

- واضح رہے کہ یہ سب کچھ ایک واضح ہدف کو سامنے رکھ کر کیا گیا' تا کہ دین کو ایک بار پھر غالب قوت بنایا جا سکے' اُمت ایک بار پھر اپنے اصل مشن کی علم بردار بن کر اُٹھے' اپنے گھر کی اصلاح کرے اور پھر انسانیت تک اس آبِ حیات کو پہنچانے کا کارنامہ انجام دے' جس میں سب انسانوں کی فلاح ہے۔ گویا زمانہ سازی اس کی جدوجہد کا اصل ہدف ہو۔

یہ چھ نکات ہیں جن پر سید مودودی علیہ الرحمہ نے اُمت مسلمہ کو جمع کرنے اور بیسویں صدی کی اسلامی جدوجہد کو ان کے مطابق مرتب کرنے کی سعی کی۔

سید مودودیؒ کا طرزِ فکر

میں جس چیز کو سید مودودی کی 'طرزِ فکر' کہتا ہوں اس کا پہلا نکتہ دین کا یہ تصور' دین کی دعوت اور اقامت کا یہ وژن اور اس وژن کے مطابق اُمت کو متحرک کرنے کے لیے وہ تنظیمی اقدام ہے' جو جماعت اسلامی اور اس کی برادر تنظیموں کی شکل میں' ان کی قیادت اور رہنمائی میں وجود میں آئیں۔ لیکن سید مرحوم کے 'طرزِ فکر' کا پورا احاطہ صرف اس مرکزی نکتے کی شکل میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ان اصولوں اور ضابطوں کی نشان دہی بھی ضروری ہے جو سید مودودیؒ کو اس مرکزی نکتے تک لائی اور جس کے لیے انھوں نے اپنی ساٹھ سالہ جدوجہد میں اپنے ساتھیوں ہی کو نہیں' پوری اُمت کو بھی تلقین اور وصیت کی۔ اس رہنمائی کے مرکزی نکات یہ ہیں:

الف- اسلامی فکر و عمل کی آبیاری کہ اُمت اور اس کے ایک ایک فرد کی قوت کا اصل منبع اللہ سے تعلق اور ایمان' رب کی پہچان ہے۔ صرف اسی خالق و مالک کے دامن کو تھامنے کا نام ایمان کامل ہے۔ عقل اور وسائل کا اپنا مقام ہے اور بہت اہم مقام ہے' لیکن اولین چیز اللہ پر ایمان اور اس کے صحیح تقاضوں کا شعور ہے۔ پھر اللہ پر بھروسا اور صرف اس سے استعانت ہی مسلمانوں کی قوت کا اصل منبع ہے۔ توحید کی حقیقت گویا زندگی کے تمام معاملات کے حل کے لیے شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

ب- قرآن و سنت اس اُمت کی رہنمائی کا اصل سرچشمہ ہیں۔ فقہ' تاریخ' مسلمانوں کے افکار' اجتہادات اور تجربات سب اپنے اپنے مقام پر ضروری ہیں۔ ماضی سے رشتہ اور روایت کا احترام' تہذیبی شناخت اور تسلسل کے لیے ضروری ہیں' لیکن ہدایت کے ماخذ کی ترتیب میں قرآن سب سے اولین ہے اور سنت اس کا لازمی حصہ۔ اسلاف سے محبت' ان سے تعلق' ان کا احترام از بس ضروری ہے' لیکن حق کا معیار صرف اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور طریقہ ہے۔ اولین دور میں مسلمانوں کی ترقی کا اصل سبب اللہ سے رشتہ اور اللہ کی کتاب سے تعلق اور اللہ کے رسولؐ کو یہ مرکزی حیثیت دینا تھا۔ افسوس کہ بعد میں یہ ترتیب بدل گئی۔

فقہ کا بڑا اہم کردار ہے اور رہے گا' لیکن ہر دور میں اور خصوصیت سے آج کے دور میں تمدن کے احوال و ظروف کی ہر سطح پر ایسی بنیادی تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں کہ زندگی سے دین کی مفید مطلب مطابقت (relevence) کو دوبارہ منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اسی وقت ممکن ہے کہ الاول فالاول کے اصول پر قرآن و سنت کو مرکزی حیثیت دی جائے اور ان کے سائے تلے فقہ اور روایت سے استفادہ کیا جائے' اور خصوصیت سے نئے مسائل کے حل کے لیے اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسولؐ کی سنت ہی کو اولین سرچشمہ بنایا جائے۔ اجتہاد اور فکری آزادی پر جو خود ساختہ اور ناروا پابندیاں لگ گئی ہیں' ان سے چھٹکارا پایا جائے۔ یہ کام نہ درایت سے بغاوت کے انداز میں ہو اور نہ روایت کا اسیر بن کر کیا جائے۔ فکری اور عملی جدوجہد کے لیے بھی اور تعلیم کے پورے نظام میں بھی اعتدال کے ساتھ صحیح ترتیب کا احیا ضروری ہے۔

ج- اس کام کو انجام دینے کے لیے اصول اور فروع، مقصد اور پالیسی کے فرق، نصب العین اور اقدار اور ضابطوں اور طریق کار کا تعلق، بنیاد اور تفصیل میں تمیز، منصوص اور غیر منصوص اور مسنون اور غیر مسنون کے مراتب کا لحاظ اور سنت اور بدعت کی حقیقی تفہیم ضروری ہے۔ تقلید کے لمبے دور میں ان ترجیحات، اور بنیادی اصولوں اور ضابطوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور آج تجدید و احیا کا کام انجام دینے کے لیے ان کی پاس داری ضروری ہے۔

ان تمام پہلوؤں پر کھل کر بحث ہو، ترجیحات کا صحیح تعین ہو اور تقدیم و تاخیر اور راجع [رجوع کرنے والی] اور غیر راجع کی حدود اور شکلوں کا صحیح شعور پیدا کیا جائے۔ نیز عصری حالات کے مطابق لیکن قرآن وسنت سے مکمل وفاداری کے ساتھ، روایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کو زندگی کا رہنما بنایا جائے، تاکہ جمود کو توڑ کر صحت مند حرکت کو پھر حقیقت کا روپ دیا جائے۔ ایسی ہی حرکت میں برکت ہے۔

د- اس کام کو انجام دینے کے لیے زمانے کے حالات، مسائل اور ان تبدیلیوں کا تنقیدی مطالعہ اور تجزیہ بھی نہایت ضروری ہے۔ درحقیقت یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا اپنے اصل نصب العین، اصول و اقدار، قانون و احکام، ترجیحات اور مطلوبہ خطوط کار کے تنفیذی عمل کا اطلاق۔ ایک طرف اُمت مسلمہ کی موجودہ حالت (status quo) اور روایت پر ہونا چاہیے تو دوسری طرف دورِ حاضر کی غالب تہذیب اور اس کے زیر اثر پوری دنیا کے نظام اور طریق واردات کا محاکمہ ہونا چاہیے۔ ہماری اپنی تہذیبی ترقی کے سلسلے کا جو انقطاع واقع ہوا ہے، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جو خلا واقع ہوا ہے، اسے پورا کرنے کے لیے اجتہادی بصیرت کی ضرورت ہے، جو نہ غالب تہذیب کی نقالی سے ممکن ہے اور نہ خود اندھی تقلید پر انحصار کرنے سے کچھ خیر رونما ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے خیر و شر میں تمیز اور اپنے تجربات میں سے مفید کو جاری رکھنا اور راہ کی رکاوٹوں کو دُور کرنا اور غالب تہذیب کا بھی ایسی ناقدانہ نگاہ سے مطالعہ کرنا کہ اس کے ان پہلوؤں سے استفادہ ممکن ہو جو ترقی کے اصل اسباب ہیں اور ان تمام برائیوں اور خباثتوں سے اجتناب کرنا کہ جو انسانی زندگی کو بگاڑ اور فساد کی جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ خذما صفا ودع ما کدر۔

ہ- اس پورے کام کو انجام دینے میں ایک اور پہلو کی فکر ضروری ہے۔ وہ پہلو، وہ مقصد اور نظریے سے حقیقی معنوں میں مکمل وفاداری (کمٹ منٹ) کے ساتھ حقیقت پسندی (realism) اور اپنے دین کے اصولوں کا نئے حالات میں اطلاق اور اس کے لیے جس دانش و بصیرت (practical wisdom) کی ضرورت ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک استعمال ہے۔ سید مودودی نے اس سلسلے میں بار بار حکیم حاذق کی مثال دی ہے جو بزرگوں کے نسخوں کا آنکھیں بند کرکے استعمال نہیں کرتا، بلکہ مریض کے حال اور دواؤں کی خاصیت کو سامنے رکھ کر طب کے ابدی اصولوں کا ہر ہر مریض پر الگ الگ اطلاق کرتا ہے۔ سید مودودی نے صاف لفظوں میں کہا تھا: ''حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہادِ فکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقعے کے لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے، اسے اختیار کرتا ہے''۔ یہ زاویہ نظر سید مودودیؒ کے طرزِ فکر کا اہم حصہ ہے۔

و- اس اصول کی روشنی میں سید مودودیؒ نے بڑے غور و فکر کے بعد اصلاح کے لیے جس طریق کار کی نشان دہی کی، اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

- ایمان کا احیا اور تقویت
- فکر کی تشکیل نو --- یعنی اسلامی افکار کی تشکیل و تعمیر میں وقت کے مسائل اور رجحانات کو ملحوظ رکھنا، اپنے دور کے افکار کا مطالعہ اور ان پر تنقیدی نظر اور نئے حالات اور مسائل کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل تلاش کرنا۔

- افرادکار کی تلاش‘ تیاری اور تنظیم وتربیت۔
- تدریج کے اصول کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو کی کوشش اور اس میں کھلے انداز میں‘ آزادانہ بحث ومباحثہ‘ دعوت‘ تعلیم اور تعلم کا طریقہ--- خفیہ طریقوں‘ جبر‘ غیر قانونی اور غیر اخلاقی طریقوں سے اجتناب‘ جمہوری عمل اور رائے عامہ کی تبدیلی کے ذریعے اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد۔ ہر اس طریقے سے اجتناب جو فساد فی الارض کا باعث ہو۔
- صحیح طریقے سے اجتماعی جدوجہد--- اور وہ بھی ایک تربیت کے ساتھ‘ گھر سے آغاز ہو‘ اپنے معاشرے کی اصلاح اور اپنے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد ہو‘ اُمت مسلمہ کا اتحاد اور اُمت کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر وترقی کا شعور ہو‘ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پہنچانے اور اللہ کی بندگی کی طرف بلانے کا ذوق اور کوشش ہو اور انصاف پر مبنی عالمی نظام کے قیام کی فکر۔
- اس پورے کام کو قرآن وسنت کے ابدی اصولوں اور ہدایات کے مطابق انجام دینا۔ اپنے وقت کے تمام جائز اور مفید ذرائع اور وسائل کو اس دعوت کی خدمت میں استعمال کرنا اور مقابلے کی قوت حاصل کرنا--- وقت کا تقاضا ہے کہ اسلام کے پیغام کو آج کی زبان میں‘ آج کے حالات اور مسائل سے مربوط شکل میں پیش کیا جائے اور اس سلسلے میں کسی تغافل یا تعصب کا شکار نہ ہوا ہو جائے۔ سارے وسائل اللہ کی دین [گفٹ] ہیں اور انھیں اللہ کے دین (اسلام) کی خدمت میں استعمال کرنا‘ ان کا صحیح ترین استعمال ہے۔ یہ وسعت اور جدید کاری اسلام کے مزاج کا حصہ اور وقت کی ضرورت ہے۔
- دعوت دین اور اقامت دین کا یہ کام پتھر کی طرح جامد (monolithic) نہیں ہے۔ اس میں تنوع اور تکثیر (plurality) ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر بھی ہے۔ نیز یہ کام عجلت میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بڑا صبر آزما اور دیرپا کام ہے۔ اس میں منزل تک پہنچنے کا کوئی مختصر راستہ (short cut) نہیں ہے۔ اس وژن کا ثبات افرادِ کار کی تیاری‘ عمل اور جدوجہد میں استقامت‘ تجربات سے سبق سیکھنے اور بندگلی سے راستہ نکالنے‘ اپنے مشن اور مقصد پر اعتماد‘ اللہ پر بھروسا اور مسلسل قربانی پیش کرنے میں ہے--- گویا ایمان‘ اجتہاد اور جہاد کے عملی اظہار کے بغیر احیاے اسلام کی منزل سر نہیں کی جاسکتی۔
- اس کام کی انجام دہی کے لیے ایک نئی قیادت کا اُبھرنا ضروری ہے‘ اور یہ قیادت محض فکری اور محدود دینی میدان ہی میں نہیں‘ بلکہ زندگی کے ہر میدان: فکروفن‘ سائنس اور ٹکنالوجی‘ معاشرت اور معیشت‘ ادب اور ثقافت‘ سیاست اور بین الاقوامی تعلقات میں ہو۔

یہ وہ مرکزی نکات ہیں جن سے سید مودودی کا طرزِ فکر عبارت ہے۔ اس میں مقصد کا شعور‘ اور دین کے سرچشموں سے وفاداری بھی ہے اور اس کے ساتھ آزادیِ فکر‘ شوریٰ‘ نئے تجربات‘ عصری ضروریات کا شعور‘ مقابلے کی قوت کی فراہمی اور مردانِ کار کی تیاری سب شامل ہیں۔ سید مودودی نے نئے حالات میں نئی حکمت عملی اختیار کرنے اور نئے تجربات کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اور یہ بھی ان کے ’طرزِ فکر‘ کا ایک اہم پہلو ہے۔

سید مودودیؒ کے طرزِ فکر کے مختلف گوشوں پر کلام کرنے کے بعد' اس موضوع پر بات کرنا مناسب ہوگا کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں پاکستان ہی نہیں' پوری دنیا میں آج تحریکِ اسلامی کس مرحلے میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فکری میدان میں اسلام کے ایک مکمل اور جامع دین اور نظریہ حیات ہونے اور اس نظریے کو غالب کرنے کے لیے انفرادی جدوجہد کے ساتھ اجتماعی تحریک کی ضرورت تو اب روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

اسلامی تحریکوں کے مؤسسین نے (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں بارش کرے) یہ کام بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اور ان کے اخلاص سے اجتماعی جدوجہد کا آغاز ہوگیا ہے---لیکن ہمارے خیال میں یہ صرف آغاز ہوا ہے' تکمیل کی منزل ابھی بہت دُور ہے اور ہمیں اور پوری اُمت کو مسلسل دعوت عمل دے رہی ہے۔ اس آغاز نے جہاں مسلمانوں کو نیا جذبہ' نئی روشنی' نئی اُمنگ اور زندگی کے لیے ایک خوب صورت ہدف فراہم کیا ہے' وہیں مخالفین کے لیے بھی خطرے کی گھنٹیاں بج گئی ہیں۔ اسی لیے وقت کے فرعونوں اور ہامانوں کی زبان سے 'کروسیڈ' کی آوازیں بلند ہورہی ہیں اور مختلف عنوانوں سے اسلامی احیا کو اصل نشانہ اور خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہارورڈ یونی ورسٹی کے امریکی پروفیسر سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب The Clash of Civilizations (تہذیبوں کا تصادم) میں بہت صاف الفاظ میں مغرب کے نقطۂ جنگ کو پیش کر دیا ہے:

> مغرب کا حقیقی مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے' بلکہ خود اسلام ہے۔ اسلام جو ایک مختلف تہذیب ہے جس کے ماننے والے اپنے تشخص کی فوقیت کے علاوہ طاقت کی کمزوری کا شکار ہیں۔ اِدھر اسلام کے لیے' سی آئی اے یا امریکی محکمہ دفاع اصل مسئلہ نہیں ہیں' بلکہ خود مغرب مسئلہ ہے' جو ایک مختلف تہذیب ہے۔ ایسی تہذیب' جس کے ماننے والے اپنی ثقافت کی آفاقیت کے قائل ہیں' اور اپنی ثقافت کو پوری دنیا پر حاوی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی عوامل ہیں' جو اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کو فروغ دے رہے ہیں۔ (حوالہ بالا' ص ۲۱۷-۲۱۸)

مغربی مفکرین اسلام کو ہوّا اور دشمن بنا کر پیش کر رہے ہیں اور اس کی روشنی میں نقطۂ جنگ بنانے میں مصروف ہیں' جب کہ مسلمان اُمت اور اسلامی تحریکوں کا اصل مسئلہ کسی سے جنگ یا مقابلہ نہیں' بلکہ اپنے گھر کی اصلاح اور تعمیر ہے۔ افکار و نظریات کا تبادلہ اور رد و قبول انسان کا بنیادی حق ہے' جسے جنگ سے منسلک نہیں کرنا چاہیے۔ اہلِ مغرب کے دانش وروں اور ان کے اہلِ حل و عقد کا مرض بھی اس اقتباس سے واضح ہے کہ وہ طاقت کی بنیاد پر یہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ اپنے تصورات اور کلچر کو دوسروں پر مسلط کرے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بگاڑ کی جڑ اسلام یا مسلمانوں کی بے بسی نہیں' مغرب کا یہ فاسد نظریہ ہے۔ لیکن آج مسلمان اس سے غافل ہیں کہ اپنی پوزیشن کو دلیل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کریں اور مغربی میڈیا نے عام لوگوں کے ذہنوں کو جس طرح مسموم کر دیا ہے' اس کا بھرپور مقابلہ کرسکیں۔

یہ مقابلہ کسی ادھورے عمل اور قریبی یا مختصر راستے (shortcut) سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے تو وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا' جو بیسویں صدی کے آغاز میں ساری کمزوریوں کے باوجود احیاے اسلام کی تحریکات کے مؤسسین نے اختیار کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بیسویں صدی کے آغاز اور اکیسویں صدی کے اوائل میں بہت سی مماثلتیں دیکھ رہے ہیں۔

ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد افغانستان اور عراق پر امریکا کی وحشیانہ فوج کشی اور ساری دنیا میں نام نہاد 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام پر فکری' ابلاغی' سیاسی اور عسکری میدانوں میں خونیں جارحیت نے صورت حال کو اور بھی گمبھیر بنا دیا ہے۔ اس وقت محض جذباتی انداز میں کوئی فوری انتقامی کارروائی اسلام اور مسلمانوں کے حقیقی مقاصد اور اہداف کی خدمت نہیں کر سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے فکر اور تجربات کی روشنی میں' اکیسویں صدی کے لیے مسلمان اور خصوصیت سے اسلامی تحریکیں اپنی حکمت عملی وضع کریں۔

اُمت کو درپیش چیلنج

اس وقت جو بنیادی چیلنج مسلم اُمہ کو درپیش ہیں ان کے دو بڑے بڑے محاذ ہیں: ایک دفاعی اور دوسرا تعمیری۔ ان دونوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کی جا رہی ہیں:

جس طرح بیسویں صدی کے آغاز میں یورپی استعمار' مسلم دنیا پر مسلط تھا' اسی طرح اب اکیسویں صدی کے آغاز میں ہمارا واسطہ امریکی استعمار سے ہے' لیکن جوہری فرق کے ساتھ۔

اس وقت امریکا عسکری اعتبار سے واحد سوپر پاور ہے۔ اس کا جنگی بجٹ باقی تمام دنیا کے تمام ممالک کے مجموعی بجٹ کے برابر ہے۔ اس کی معاشی صلاحیت دنیا کی معیشت کا ایک چوتھائی ہونے کے باوجود ایسی نہیں ہے کہ بہت لمبے عرصے تک وہ محض عسکری قوت کے بل پر دنیا کے بڑے حصے کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔

ہر چند کہ امریکا کی کوشش ہے اور یہی اس کی موجودہ قیادت کا اعلان شدہ ہدف بھی یہ ہے کہ وہ آیندہ پچیس پچاس سال تک واحد سوپر پاور رہے اور کوئی مدمقابل اُبھرنے نہ پائے۔ لیکن یہ دھونس اور دعویٰ قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ البتہ عسکری قوت کے ساتھ ابلاغی قوت ایک ایسے مقام پر ہے کہ دنیا کی آبادی کے بڑے حصے کے ذہنوں کو اس سے مسموم اور خائف کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ تاہم' اس میدان میں بھی یہ قوت اور اختیار غیر محدود نہیں ہے اور صحیح معلومات کو چھپانے اور دنیا کو دھوکے میں رکھنے کی ایک حد ہے--- جیسا کہ عراق پر حملے کے اسباب کے سلسلے میں سامنے آیا ہے۔ پھر دنیا کے دوسرے ممالک' خصوصیت سے یورپ کے بڑے ملک' چین اور ایک حد تک روس ابھی امریکا کو چیلنج نہیں کر رہے' لیکن پوری طرح اس کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ امریکا کی اس کھلی دھونس کے خلاف ان معاشروں میں اضطراب اور بے چینی کی لہریں ابھر رہی ہیں۔ بے اطمینانی کی یہ لہر ساری دنیا میں اور خاص طور پر یورپ حتیٰ کہ امریکا میں عوامی قوت کی صورت میں ابھر رہی ہے۔

عالم گیریت (globalization) کے بہت سے نقصانات اور خطرات ہیں' لیکن اس کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں اور ان میں سے ایک گہرا جذبہ بغاوت ہے جو روز بروز بڑھ رہا ہے اور عالمی سطح پر ایک مثبت پہلو ہے۔ آج کی دنیا کا سب سے پریشان کن پہلو عسکری' سیاسی' معاشی اور فنی سطح پر قوت کی عدم مساوات ہے--- لیکن اس کے خلاف متبادل اضطرابی لہروں (countervailing powers) کا رونما ہونا بھی ایک فطری عمل ہے۔ اس کے لیے صبر اور حکمت سے کام کرنے' فوری تصادم سے بچنے' صحیح تیاری کرنے' عالمی سطح پر اقدام کے لیے مناسب امکان کو تلاش کرنا ضروری ہے۔

عالمی صورت حال

عالمی تناظر کا تجزیہ بڑی تفصیلی بحث چاہتا ہے۔ البتہ ہم اس پورے تناظر کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

۱- اکیسویں صدی کا سب سے اہم پہلو 'عالم گیریت' ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں' کہ تمام ناہمواریوں کے باوجود اب پوری دنیا ایک اکائی بنتی جا رہی ہے اور کسی کے لیے بھی اس سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں رہا۔ اب صرف اپنی دنیا میں بند رہنے کا راستہ قابلِ عمل نہیں رہا۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں' دنیا کا ہر واقعہ آپ کو متاثر کر رہا ہے۔ تجارت اور سرمایہ کاری ہی نہیں' سرمایہ' اشیا' انسانوں اور معلومات کی برق رفتار نقل و حرکت کی وجہ سے حالات میں جوہری فرق واقع ہو چکا ہے' جس نے بے شمار خطرات اور مسائل کو جنم دیا ہے' اور ساتھ ہی بے پناہ امکانات کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔

ماضی میں تحریکِ اسلامی کے لیے ممکن تھا کہ اس کے اولین اور اصل مخاطب صرف مسلمان ہوں' لیکن آج یہ ممکن نہیں رہا۔ اس لیے جو کچھ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے' اسے ساری دنیا میں سنا جا رہا ہے اور نتائج اخذ کیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اسلام کے علم بردار صرف خود کلامی تک دعوت کو محدود نہ رکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ فکری سرحدیں بہت دُور دُور تک پھیل گئی ہیں۔ اس لیے غیر مسلموں سے خطاب اور ان تک دعوت کو موخر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بڑا بنیادی فرق ہے جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۲- مشرق اور مغرب اس طرح شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ دونوں کے الگ الگ مسائل ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے جملہ پہلوؤں سے صرفِ نظر کر کے کلام ممکن نہیں رہا۔ بلاشبہہ مسلم دنیا کا مسئلہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان' اللہ کے رسولؐ سے وابستگی اور اسلام سے ایمانی' جذباتی اور ثقافتی تعلق موجود ہے' مگر دین کے صحیح اور مکمل تصور اور دین کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل اور احترام میں کمی کے نتیجے میں یہ ہدف نہیں پایا جا سکتا۔ اس لیے اسلامی احیا کے ساتھ ایمان کا تعلق اجتماعی نظامِ زندگی کے لیے حقیقی چیلنج بن جاتا ہے۔

دوسری طرف مغربی دنیا میں اجتماعی زندگی متعدد خوبیوں اور وسائل سے مالا مال ہے' جن میں قانون کی حکمرانی' رائے کی آزادی' انصاف کے حصول میں سہولت' دولت کی فراوانی' تعلیم و تحقیق' اور ایجاد و اختراع کا عام ہونا قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن دولت اور وسائل کی ارزانی میں اخلاقی اقدار کی پامالی' انسانی تعلقات کی تباہی' خاندانی نظام کا انتشار' جرائم اور ظلم و استحصال کی بہتات اور سب سے بڑھ کر دل کا چین' روح کا سکون اور اللہ سے تعلق کا فقدان' زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے ہے۔ اس پس منظر میں بات صرف نظام کے اصلاح واحوال کی نہیں' دل کی اصلاح اور اللہ سے تعلق کی بازیافت کی ہے۔ ہر اس تعلق کی بنیاد پر اخلاقی اقدار کے احیا اور ہر سطح پر انصاف کے حصول کی خواہش کا جذبہ ہے۔ یہ دونوں پس منظر اب دو الگ الگ دنیا میں نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی میدان کے دو محاذ ہیں۔ تحریکِ اسلامی اس جوہری فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

۳- پھر اس نئے عالمی تناظر میں ایک عالمی طاقت کا ہمہ پہلو غلبہ ہے اور اس کے نتیجے میں سیاسی' مادی اور تہذیبی میدانوں میں وسائل' قوت اور اختیارات میں ایک شدید عدم توازن رونما ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشی اور سیاسی نظام کا غلبہ ہے جو ساری دنیا کے وسائل کو ایک محدود اقلیت کی خدمت اور چاکری کے لیے وقف کر رہا ہے۔ سرمایہ داری کا نیا روپ اور منڈی کی معیشت (مارکیٹ اکانومی) کے نام پر مغربی اقوام اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا دنیا پر غلبہ آج ایک دوسرے میدانِ جنگ کا منظر پیش کرتے ہیں۔

مخصوص استعماری مقاصد کی حامل نام نہاد این جی اوز کا ایک خاص کردار ہے اور ریاستی قوت (state power) کے ساتھ ملٹی نیشنل کارپوریشن اور این جی اوز اس معاشی اور نظریاتی عالمی میدان کے اصل کردار ہیں، جن سے معاملہ کرنا وقت کا اہم چیلنج ہے۔

۴- ماضی کے سامراج کے لیے صحیح لفظ نوآبادیت (colonialism) تھا، جس میں سامراجی قوتیں دوسرے ممالک پر قبضے (occupation) کے ذریعے ان کے وسائل پر تسلط جماتی تھیں۔ آج کے سامراج نے بالکل ایک دوسرا روپ دھارلیا ہے۔ اب قبضہ بھی ایک حربہ ہے لیکن اصل حربہ وسائل کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا اور عملاً دوسرے ممالک پر قبضے کے بغیر ان کے وسائل اور مردانِ کار کو اپنی گرفت میں لے لینا ہے۔ جس کے لیے میڈیا سے لے کر معاشی تسلط اور سیاسی دخل اندازی، دھوکا دہی اور وفاداریوں کی خرید کا راستہ اختیار کیا جارہا ہے۔ بالادستی حاصل کرنے کے سامراجی ہدف نے نقشۂ جنگ کو بالکل بدل دیا ہے۔

۵- فکری غلبہ اور ثقافتی اور تہذیبی تسلط ہمیشہ سے اہم تھے مگر آج کے میڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلاب میں ابلاغ کے ذرائع اور مائیکروچپ (micro-chip) نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اثر و تاثیر کی یہ قوتیں غالب اقوام کو وہ مدد دے رہی ہیں جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں تھیں۔ اب اس نئے حربے سے فوج کشی کے بغیر ملکوں، علاقوں اور قوموں کو فتح کیا جاسکتا ہے اور ان کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی ہی کو متاثر نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے ذہنوں کو بھی مسموم، مفلوج اور محکوم بنایا جاسکتا ہے۔

۶- اس تناظر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکا کی قیادت ان عناصر کے ہاتھوں میں ہے جو ایک نئی قدامت پسند تحریک (neo-con) سے وابستہ ہیں۔ جس میں عیسائی مذہبی قوتوں کے ساتھ عالمی صہیونی طاقت بھی شریک ہے (اور اسے برہمنیت کی بھی تائید حاصل ہے)۔ اس قوت کا گٹھ جوڑ امریکا کے بم باز اور ہلاکت پرور حکمرانوں سے ہوگیا ہے۔ یہ اتحاد عالمی دراندازیوں کی حکمت عملی وضع کررہا ہے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے اصل ہدف اور مقابل کی حیثیت سے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ اصل ہدف جیسا کہ ہم نے سیموئیل ہنٹنگٹن کے اقتباس سے پیش کیا 'اسلام' ہے، محض نام نہاد دہشت گردی نہیں۔ جنگ صرف سیاسی محاذ پر نہیں، فکری اور تہذیبی محاذ پر بھی مسلط کی گئی ہے۔

یہ ہے اکیسویں صدی کا وہ تناظر جس میں اسلامی تحریکات کو اپنی داخلی اور عالمی حکمت عملی وضع کرنی ہے۔ ان حالات کا صحیح اور گہرا ادراک اولین ضرورت ہے۔

مقابلے کی حکمت عملی اور تقاضے

آج 'زمانہ شناسی' یا وقت کی نبض اور رفتار کو سمجھنے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ کام پوری دیانت، علمی گہرائی، حقیقت پسندی اور انصاف کے ساتھ کیا جائے اور ہر تعصب سے بالا ہو کر کیا جائے۔ تنقید کرنے سے پہلے تفہیم کی ضرورت ہے۔ تفہیم ہی سے یہ متعین ہو سکے گا کہ کیا قابلِ قبول ہے اور کیا ناقابلِ قبول۔ کہاں کوئی اشتراک ممکن ہے اور کہاں مقابلہ ناگزیر ہے۔ اور مقابلہ بھی مناسب تیاری، صحیح حکمت عملی، طویل اور مختصر مدت کی ترجیحات کے تعین اور اپنی قوت کے صحیح اندازے کے ساتھ ہونا چاہیے۔

ان حالات سے خوف زدہ ہونے یا امریکا اور وقت کی غالب قوتوں کا کاسہ لیس بن جانے اور ان کی چھتری تلے پناہ لینے سے اُمت مسلمہ کو احتراز کرنا چاہیے۔ تصادم نہ اس وقت ممکن ہے اور نہ مطلوب۔ لیکن حاشیہ برداری بھی کوئی غیرت مندانہ راستہ نہیں ہے۔ عزت اور وقار کا راستہ ہی محتاط مزاحمت کا راستہ ہے' اور مقابلے کے لیے اس جنگ میں تمام ہی حلیفوں سے سیاسی' ریاستی اور عوامی سطح پر تعاون ضروری ہے۔ مسلمان اُمت اور ممالک کے لیے تنہائی (isolation) سے بچنا ضروری ہے۔ آپس کے تعاون اور اتحاد کی بھی اشد ضرورت ہے۔ موثر ڈپلومیسی ہی کے ذریعے اپنے مفادات کا تحفظ اور مستقبل کی منصوبہ بندی ہوسکتی ہے۔ ہمیں خود اور دوسروں سے مل کر انسانی حقوق' آزادی اور قانون کی حکمرانی کے لیے کھلے دل سے کام کرنا چاہیے۔ بین الاقوامی قانون کے احترام' حقیقی جمہوری قدروں کے تحفظ اور انصاف کے حصول کے لیے عالمی جدوجہد میں مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان سب قوتوں سے تعاون کرنا اور تعاون حاصل کرنا چاہیے جن سے جزوی طور پر ہی سہی مقاصد کا اشتراک ممکن ہے۔

ان تمام خطرات کے پورے پورے شعور کے باوجود ہماری نگاہ میں امریکہ سمیت' تمام مغربی اقوام سے مکالمے (dialogue) کی ضرورت ہے' جس کے تین پہلو ہیں:

۱- حکومتوں سے بات چیت اور افہام و تفہیم

۲- ان ممالک کے عوام اور اہل دانش تک رسائی اور اپنی بات پہنچانے کی کوشش

۳- پھر ان ممالک میں ایسے تمام عناصر سے ربط اور تعاون کی راہوں کی تلاش' جن سے کلی یا جزوی اشتراک عمل ممکن ہے۔

یہ نہ تو سمجھوتے کا راستہ ہے اور نہ کسی کمزوری کی علامت ہے۔ یہ حقیقت پسندی کا تقاضا' اور دعوت کا راستہ ہے۔

اس سلسلے میں مسلمان حکمرانوں سے بھی ربط کی ضرورت ہے اور ان میں برے اور کم برے میں تمیز کرنا ہوگا۔ بلاشبہہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُمت کے عوام اور حکمرانوں میں بعد المشرقین ہے اور ان کے درمیان نہ صرف ایک خلیج حائل ہے' بلکہ دونوں کے عزائم' جذبات' اہداف اور مفادات تک میں ایک واضح تفاوت بلکہ تضاد ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکہ کے ہم نوا' اس پر اعتماد کرنے والے اور اس کے حلیف حکمران بھی دل کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ احساس رکھتے ہیں کہ کسی وقت بھی وہ ان کو دھوکا دے سکتا ہے۔ ان حالات میں ان حکمرانوں کا اپنا مفاد بھی اسی میں ہے کہ اپنے عوام سے قریب ہوں اور ان سے تصادم کی جگہ ایسا رشتہ قائم کریں کہ مل جل کر سب کے مفاد کا تحفظ ہوسکے۔ یہ نازک اور مشکل کام ہے لیکن اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اسلامی تحریکات کو سمجھنا چاہیے کہ ان کی اصل طاقت اللہ پر بھروسے کے بعد عوام کی طاقت ہی ہوسکتی ہے اور انھیں وہ راستہ اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ عوام کو ساتھ لے کر اپنے ملک اور اُمت مسلمہ کے مفاد کا بھی تحفظ کرسکیں۔ اس مقصد کے لیے جس حد تک اور جس طرح مسلمان حکمرانوں پر اثر انداز ہونا ممکن ہو' اس کی فکر کرنی چاہیے۔

اس کے ساتھ ان عالمی مسائل پر ایک واضح موقف اختیار کرنا ضروری ہے جو آج انسانیت کے مرکزی مسائل ہیں۔ ان میں انسانی حقوق' عدل اجتماعی' معاشی ترقی اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم' خاندان کے نظام کا انتشار' طبقاتی تصادم' مظلوم اقوام کی دادرسی اور دنیا کو ظالم حکمرانوں اور سرمایہ پرستوں کی گرفت سے نجات سرفہرست مسائل ہیں۔

عالمی سطح پر ہماری نگاہ میں آج سب سے بڑا مسئلہ 'ورلڈ میڈیا' میں مسلمانوں اور خصوصیت سے اسلامی تحریکات کے لیے جگہ حاصل کرنا اور اپنی بات کو دنیا تک پہنچانے کے لیے راستہ نکالنا ہے۔ آج میڈیا کی قوت' عسکری قوت سے کسی طرح کم نہیں۔ اسلامی تحریکات نے حرف مطبوعہ (printed word) کو تو ذریعہ بنایا ہے' لیکن جدید ابلاغی ذرائع میں جو چیزیں سب سے اہم ہیں' یعنی الیکٹرانک میڈیا اور ڈیجیٹل پاور بڑی حد تک یہ ذرائع ابھی ہماری دسترس سے باہر ہیں اور یہ ہماری بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس میدان میں خلا کو پُر کرنا اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔

اسی طرح ساری کمزوریوں اور مشکلات کے باوجود' مسلمان ملکوں کا اتحاد' ان کا مشترک محاذ' اور متعین مسائل کے بارے میں ایک مشترک موقف' معاشی اور سرمایہ کاری کے میدان میں تعاون اور بالآخر عسکری تعاون اور ہم آہنگی بھی وقت کی ضرورت' اور سب کے مفاد میں ہیں۔

مسلم ممالک کا تعاون اسلام اور اُمت کے تصور کا تقاضا تو ہے ہی' لیکن آج تو یہ ہر ملک' حتیٰ کہ اس کے حکمرانوں کی بھی ایک ضرورت بن گیا ہے۔ اس لیے اسلامی تحریکات کو عالمی سطح کی حکمت عملی بناتے وقت ان پہلوؤں کو سامنے رکھنا چاہیے۔

داخلی چیلنج اور لائحہ عمل

دفاعی اور عالمی معاملات میں صحیح حکمت عملی کے ساتھ ہمارا اصل چیلنج داخلی ہے اور فکرِ مودودیؒ کی روشنی میں یہی وہ میدان ہے جس کے بارے میں اسلامی تحریکات کو گہرے سوچ بچار اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اس پہلو سے چند نکات قابلِ توجہ ہیں:

دین کا مجموعی تصور اور بنیادی اصولوں کی تشریح کے باب میں مؤسسین نے بڑا قیمتی اور راہ کشا کام کیا ہے' لیکن اس سلسلے میں چند اہم کام ہیں جن کی طرف توجہ وقت کا تقاضا ہے۔

- پہلی چیز اس فکری اور دعوتی کام کو جاری رکھنا اور وقت کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ فکری محاذ ایک نہایت اہم محاذ ہے اور عملی جدوجہد کے مختلف میدانوں میں انہماک کی وجہ سے اس محاذ پر کمزوری بڑی نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں فکری میدان میں جو کام ہو رہا ہے حتیٰ کہ اسلام پر اور اسلام کے پیغام کو مسخ کرنے کے لیے جو کچھ ہو رہا ہے اس پر نظر ڈالتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی تحریکات اس میدان میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔ سید مودودیؒ نے تن تنہا وہ کام کیا جو کئی ادارے مل کر بھی نہیں کرسکتے تھے۔ آج ضرورت ہے کہ محققین اور اہلِ علم کی ایسی ٹیمیں تیار کی جائیں اور ایسے اعلیٰ تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں جو اس کام کو جاری رکھ سکیں اور آگے بڑھائیں۔ جب تک ہر دور کے اٹھائے ہوئے مسائل اور معاملات پر اسلام کے اصل سرچشموں سے استفادہ کر کے نیا لٹریچر تیار نہ ہو' ہم علمی بالادستی حاصل نہیں کرسکتے اور اس کے بغیر تہذیبی مقابلے کے میدان میں قدم نہیں جما سکتے۔

مولانا مودودیؒ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا ایک اہم ذریعہ اس علمی کام کو جاری رکھنا' آگے بڑھانا اور نئے تقاضوں کو پورا کرنا ہے جس کا آغاز انھوں نے ۸۰ سال پہلے کیا تھا۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اصولی اور مرکزی تصورات تو مؤسسین نے واضح کردیے ہیں' لیکن ان میں مزید وسعت پیدا کرنا' تفصیلات کا تعین کرنا' خصوصیت سے زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کی رہنمائی کو فکری (conceptional) پہلو کے ساتھ اطلاقی (applied) شکل میں مرتب کرنا جو ایک متوازن پالیسی کی صورت گری کرسکے' وقت کی اہم ضرورت ہے۔ نیز ہر میدان میں نئے علمی چیلنجوں کا موثر مقابلہ بھی علمی اور تحقیقی پروگرام کا حصہ ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ مؤسسین کے مخاطب بالعموم مسلمان تھے اور وہ بھی اپنے اپنے ملک اور خطے کے لوگ' جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا۔ آج دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ اسلام' مشرق اور مغرب میں موضوعِ گفتگو ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کی ذہنی اور تہذیبی سطح سامنے رکھ کر اور دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اسلام کے پیغام کو آج کی زبان میں اور آج کے ایشوز کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ یہ پیغام ان زبانوں میں پیش کیا جائے جن کے ذریعے ہم دنیا کی بڑی آبادی تک پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں انگریزی زبان نے خصوصی اہمیت اختیار کر لی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی تہذیب اور اس کی اہم تحریکوں' سوشلزم اور سرمایہ داری کے بارے میں مؤسسین نے بڑی وقیع علمی تنقید اور احتساب کا اہتمام کیا ہے۔ لیکن انسانی علوم کی اسلامی بنیادوں پر تشکیلِ نو اور آج کے سیاسی' معاشی' سماجی' سائنسی مباحث کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات کی صحیح ترجمانی اور خصوصیت سے سیکولرزم اور موڈرنزم کی نئی تشکیلات' سرمایہ داری کی جدید شکل عالمی لبرلزم اور تحریکِ نسواں کی جدید شکل اور مسلم ممالک کے معاشی' سیاسی' سماجی' علاقائی' لسانی مسائل اور اقلیتوں کے کردار کے سلسلے میں بے شمار امور اور معاملات ہیں' جن پر غوروفکر' تحقیق و جستجو اور بحث و مباحثے کے بعد مثبت طور پر ہمیں اپنا موقف پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ساری ضرورتیں صرف مؤسسین کی علمی خدمات کی تحسین اور صرف انھی کے آثار کی طباعت سے پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس کے لیے تو وہی کام جاری رکھنا ہوگا جو اسلامی تحریک کے مؤسسین نے شروع کیا تھا۔

- دوسرا بڑا مسئلہ مسلم دنیا میں ہمارے اپنے تاریخی اور روایتی اداروں کی تحلیل اور ان کی جگہ مغرب سے درآمد شدہ اداروں کے تسلط سے متعلق ہے۔ اسلامی اداروں کی تشکیلِ نو اور ان کا قیام ایک بڑا بنیادی تہذیبی چیلنج ہے۔ زندگی کا قانون ہے کہ خلا زیادہ دیر باقی نہیں رہتا۔ ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ خاندان کے سوا (اور وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے) کوئی ادارہ باقی نہیں رہا اور نئے ادارے جو باہر سے لا کر مسلط کیے گئے ہیں وہ نئی تباہ کاریوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ تعلیم' معاشرہ' مدرسہ' تجارت' معاشرت' قانون' سیاست سب اسی کش مکش کی آماج گاہ بنے ہوئے ہیں۔ روایتی ادارے اپنی پرانی شکلوں میں بحال نہیں ہوسکتے۔ درآمد شدہ نئے ادارے ہماری اقدار' روایات اور ضروریات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن تشکیلِ نو کا عمل بڑی تحقیق' محنت' تجربے' بالغ نظری اور اختراعیت (creativity) چاہتا ہے۔ مؤسسین نے اپنے زمانے میں اپنے انداز میں ابتدائی کام کیا' لیکن صرف اسی پر قناعت سے مستقبل میں کام نہیں چل ہوسکتا۔ اس چیلنج کا بھرپور مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

- تیسرا مسئلہ نئی قیادت بروے کار لانے کا ہے۔ آج کا دور علمی مہارت اور اخلاقی بالیدگی کے ساتھ پیشہ ورانہ گرفت اور اپنے اپنے میدان کار میں اختصاص کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر میدان میں مردانِ کار کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے بڑی تیاری کے ساتھ افراد سازی کی ضرورت ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ جدید علوم اور مختلف النوع صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اسلامی اصولوں' اقدار اور حساسیات (sensitivities) کا بھی مکمل ادراک ہو' مقصد کی لگن اور کردار کی خوبیوں سے بھی یہ قیادت آراستہ ہو۔ اس کے لیے وژن' پروگرام' اداروں اور وسائل کی ضرورت ہے۔ مؤسسین کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اس چیلنج کا جواب بھی ضروری ہے۔

● چوتھا مسئلہ سیاست میں تحریکِ اسلامی کے کردار کا ہے۔ بلاشبہہ یہ اسلامی تحریکات کا منفرد کارنامہ ہے کہ اس نے نظامِ حکومت کی اصلاح اور سیاسی قوت اور قیادت کو نظریے کی خدمت کا ذریعہ بنانے کے اسلامی اصول اور اسلوب کو منوالیا ہے۔ لیکن اب چیلنج عملاً تبدیلی کا ہے۔ چونکہ اس کے لیے جمہوری طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس لیے عوامی تائید کا حصول‘ عوام کی تائید اور وابستگی کو برقرار رکھنا‘ ان کی توقعات کو پورا کرنا‘ اور سیاست کی معروف خرابیوں کی اصلاح کرنا --- یہ بڑے بڑے چیلنج ہیں۔

اس سلسلے میں جو تجربات اب تک ہوئے ہیں‘ ان کے جائزے اور احتساب کی ضرورت ہے۔ اتحاد اور الحاق کے فوائد اور مضمرات پر بھی غوروفکر کی ضرورت ہے۔ ایران‘ پاکستان‘ ملایشیا‘ ترکی‘ الجزائر‘ سوڈان‘ یمن جہاں بھی مفید تجربات ہوئے ہیں‘ ان کے گہرے اور ناقدانہ مطالعے اور تجزیے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہہ تبدیلی کے عمومی عمل کی تو نشان دہی کر دی گئی ہے‘ مگر اس کی عملی تفصیلات اور اس کے گوناگوں تقاضوں پر کام کی ضرورت ہے۔ اقتدار کو متاثر کرنا‘ اقتدار میں بامعنی شرکت‘ اقتدار پر دسترس‘ غرض کتنے ہی پہلو ہیں جن کے بارے میں اسٹرے ٹیجک غوروفکر کی اشد ضرورت ہے۔ اسی طرح مختلف ملکوں میں سیاسی تجربات کے جو نتائج نکلے ہیں اور جو مسائل و مشکلات سامنے آئی ہیں‘ وہ بڑے وسیع پیمانے پر مطالعے‘ بحث مباحثے‘ شوریٰ اور نئے اقدامات کے متقاضی ہیں۔

● پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت مسلم معاشرے اور ممالک جن مسائل سے دوچار ہیں‘ ان میں علم و فن‘ سائنس اور ٹکنالوجی‘ معاشی ترقی‘ سیاسی استحکام‘ بیوروکریسی اور فوج کے کردار‘ صحافت اور میڈیا کے کردار‘ نوجوانوں کے مسائل‘ عالم گیریت کے اثرات اور چیلنج‘ عورتوں کے مسائل اور کردار‘ جرائم اور تعصبات کی کیفیت مرکزیت اختیار کر چکے ہیں --- ان سب امور پر ازسرنو غور کرنے‘ مسائل کا حل تلاش کرنے‘ نئی پالیسیاں وضع کرنے‘ تیاری کے ساتھ تجربات کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا: ’’تمام مسائل کا حل اسلام میں موجود ہے‘‘۔ اب تو اسلام کی روشنی میں مسئلے کا واضح حل پیش کرنے‘ پورا نقشہ بنانے اور اس پر عمل کر کے دکھانے کا مرحلہ ہے۔ بلاشبہہ یہ پہلے مرحلے سے زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔ ساتھ ہی یہ مسئلہ روز بروز اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ ہم اپنے نظریاتی اور اخلاقی وزن کو سیاسی وزن میں کیسے منتقل کریں اور کیسے اس کی اپنی اس حیثیت کو برقرار اور پایے دار (sustain) رکھیں۔ یہ سارے مسائل اور معاملات نئی فکر‘ نئی جدوجہد‘ اور نئے تجربات کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ کوشش ہے جس سے ہم اپنے گھر کو اور اُمت مسلمہ بحیثیت مجموعی مسلم دنیا کو درست کر سکے گی --- کہ آگے کے عالمی مراحل کا انحصار خود اُمت مسلمہ کی اخلاقی اور مادی قوت کی صحیح صف بندی پر ہے۔

● چھٹا مسئلہ اسلام کے پیغام اور مسلم ممالک کے تجربات کے صحیح ابلاغ (communication) کا ہے۔ ہم اس سلسلے میں پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اندرونی مسئلہ بھی ہے اور بیرونی بھی۔ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی صحیح سمت میں ترقی اور تشکیلِ نو اور مغرب کے ایجنڈے کے مقابلے میں اپنے ایجنڈے کے مطابق ان دائروں کی اصلاح اور تقویت وقت کی ضرورت ہے۔

ہمارا مقصد بیرونی اور اندرونی‘ دفاعی اور داخلی تعمیری میدانوں کے تمام مسائل کا احاطہ نہیں ہے۔ ہم صرف یہ توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان دونوں میدانوں میں جو مسائل اور معاملات آج درپیش ہیں‘ ان کے حل کے لیے بیسویں صدی کی اسلامی فکر میں ایک اصولی رہنمائی تو موجود ہے لیکن وقت کی اصل ضرورت اس طرزِ فکر کی روشنی میں آج کے مسائل کے لیے فکری اور عملی جدوجہد ہے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ قرآن و سنت ہی کو اصل ماخذ بنایا جائے۔ مؤسسین کی فکر سے اسی طرح استفادہ کیا جائے جس طرح انھوں نے اپنے پیش روؤں کے قیمتی کام سے استفادہ کیا‘ لیکن اسی پر قناعت کیے رکھنا خود ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

● اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نئے حالات اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تنظیمی میدان میں اور تعلیمی اور تربیتی نظام میں کن تبدیلیوں اور اصلاحات کی ضرورت ہے۔ کیا سارے کام یا بیش تر کام ایک ہی تنظیمی چھتری کے تحت کیے جاسکتے ہیں یا ان کے لیے الگ الگ انتظامات کی ضرورت ہے جو اپنے اپنے اہداف کو پیشہ ورانہ اہلیت کے ساتھ حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہوسکیں؟ تحریکی اداروں کے ساتھ باقی اداروں اور تنظیموں سے کس طرح معاملہ کیا جائے؟ ملکی سطح کے ساتھ ملّی سطح پر کام کی نوعیت کیا ہو؟ اور اداروں کا نظام اور ان کے درمیان تعاون کی کیا کیفیت ہو؟ پھر اس سے بھی بڑھ کر تحریک کے جو مختلف دائرے ہیں' ان میں سے ہر دائرے کے اندر' اور ایک دائرے کا دوسرے دائرے سے تعلق اور کاموں کی تقسیم اور ترقی کی کیا کیفیت ہو؟ اس سلسلے میں تحریکِ اسلامی کے اندر اور اس کے اپنے متعلقہ ادارے سب سے پہلا اور اساسی دائرہ ہیں۔ پھر تحریکِ اسلامی اور پورا ملک' اور ملّت اسلامیہ دوسرا دائرہ ہیں اور تیسرا دائرہ تحریکِ اسلامی' ملّت اسلامیہ اور پوری انسانیت ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے سلسلے میں اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر کیا اہداف ہوں' کیا حکمت عملی وضع کی جائے' اور کون سے ادارے قائم کیے جائیں' کیا پالیسیاں اور پروگرام مرتب ہوں اور پھر ہر دائرے کا دوسرے دائروں سے کیا تعلق ہو؟ یہ سارے امور غور و فکر بحث و مجادلے اور مناسب منصوبہ بندی کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہماری نگاہ میں سید مودودیؒ کا اصل پیغام اکیسویں صدی کے لیے یہ ہے کہ وژن' مقصد اور اصول پر یکسوئی کے ساتھ قائم رہا جائے۔ اپنے پیش رووں کی فکر اور خدمات سے احترام اور وفاداری کے ساتھ استفادہ کرتے ہوئے' جدید اور نئے مسائل اور معاملات سے صرفِ نظر نہ کیا جائے بلکہ پوری قوت سے ان سے نبرد آزما ہونے کی سعی کی جائے۔ فکر کے ساتھ نظر ِفکر' کو توجہ اور نئی جدوجہد میں مرکزی اہمیت دی جائے۔ جس روش اور طریق کار (methodology) سے مؤسسین نے کام کیا اس میں بہتری اور تازگی پیدا کی جائے' نئے حالات اور مسائل کے لیے پوری شدومد سے اسے روبہ عمل بھی لایا جائے۔ اس فکر کو وسعت اور عمق دونوں میدانوں میں آگے بڑھایا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ نئی فکر' نئی ٹکنالوجی' نئی مہارت' اور نئے تجربات کے بارے میں اسی شوق اور جذبے سے جدوجہد کی جائے جس سے پیش رووں نے اپنے زمانے میں کی تھی اور ہمارے لیے روشن نقوشِ راہ مرتب کیے تھے --- کہ آگے بڑھنے اور نئی دنیا تلاش کرنے کا یہی طریقہ ہے ؎

شاید کہ زمیں ہے وہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا